کابل میں ایک ہفتہ

(آل احمد سرور کا ایک غیر مدوّن سفرنامہ)

رفیع الدین ہاشمی

Abstract:

Prof. Aal-e-Ahmed Suroor was a prominent writer, critic and *Iqbaliat* expert. He was the editor of Anjuman Taraqi-e-Urdu's weekly news letter "*Hamari Zabaan*" published from Ali Garh. He had to travel to Kabul in June 1994 for one week. He was nominated as an observer in an international translation seminar. While coming back to India he compiled a travelogue whose title was کابل میں ایک ہفتہ . This is an unedited article which has not been indicated in any book or index. So, here, it is being revealed with some necessary notes.

Keywords: Iqbal institute, Jamia Kashmir, Kabul Museum.

تمہید اور تعارف:

پروفیسر آل احمد سرور (۹ ستمبر ۱۹۱۱ء - ۹ فروری ۲۰۰۲ء) نامور ادیب، نقاد اور اقبال شناس تھے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۴ء تک صدر شعبہ اردو کے فرائض انجام دیے۔ علی گڑھ سے وظیفہ یابی کے بعد ۲۱ مئی ۱۹۷۷ء کو کشمیر یونی ورسٹی سری نگر میں اقبال چیر پر فائز ہوئے۔ شیخ محمد عبداللہ کے تعاون سے ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، جس نے سرور صاحب کی سربراہی میں متعدد سیمی نار منعقد کیے، کتابیں شائع کیں اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔۔ بھارت میں فروغِ اقبالیات کے ضمن میں انسٹی ٹیوٹ کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے منصب سے سبک دوش ہوئے۔ (سری نگر میں دس سالہ قیام کی سرگرمیوں اور مصروفیات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

جامعہ کشمیر اور اقبالیات مرتب: ڈاکٹر بدرالدین بٹ۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سری نگر، ۲۰۰۹ء۔) سرور صاحب کا آخری زمانہ علی گڑھ میں گزرا۔

ساٹھ کی دہائی میں انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار ہماری زبان سرور صاحب کی ادارت میں علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔ جون ۱۹۶۶ء میں انھیں کابل کا یک ہفتگی سفر درپیش ہوا۔ حکومتِ ہند نے انھیں بین الاقوامی ترجمہ سیمی نار میں بطور مشاہد (observer) نامزد کیا۔ دوسرے مشاہد مالک رام تھے۔ واپسی پر انھوں نے ''کابل میں ایک ہفتہ'' کے عنوان سے رودادِ سفر چھے قسطوں میں شائع کی۔

یہ مختصر سفرنامہ، جہاں تک مجھے علم ہے، غیر مدوّن ہے، ان کی کسی کتاب میں شامل نہیں ہے۔ غالبا کسی اشاریے میں اس کا تذکرہ نہیں آیا۔ البتہ سرور صاحب نے اپنی آپ بیتی خواب باقی ہیں میں اس رودادِ سفر (کا خلاصہ) شامل کیا ہے۔ سفرنامے اور آپ بیتی میں شامل اس کے خلاصے میں مذکور بعض اسما اور بیانات میں اختلاف نظر آتا ہے۔ ہم نے متن تو سفرنامے کا اختیار کیا ہے، مگر حواشی میں اختلافات کی نشان دہی کر دی ہے۔

(رفیع الدین ہاشمی)

سفرنامہ:

(۱)

امریکہ میں ایک ادارہ ہے: ''فرنکلین بک پروگرام''، اس کی شاخیں ایران، افغانستان اور پاکستان میں ہیں۔ یہ ادارہ فارسی اور اردو میں علمی و ادبی کتابوں کی طباعت خصوصا ترجموں کی اشاعت میں مدد دیتا ہے۔ ایران اور افغانستان میں اس کی شاخوں نے مطبوعات کا ایک خاصا بڑا سلسلہ شروع کررکھا ہے۔ کابل کی اس شاخ کی طرف سے اور وہاں کی وزارتِ معارف اور یونی ورسٹی کے تعاون سے وہاں ایک سیمی نار[۱]، ۲۰ جون سے ۲۵ جون [۱۹۶۶ء] تک منعقد ہوا۔

اس سیمی نار میں ایران، افغانستان، پاکستان، تاجکستان اور ہندوستان کے نمائندے شریک ہوئے[۲]۔ ہندوستان کو دعوت صرف چند دن پہلے ملی۔ ہمارے سفیر نے کابل سے لکھا کہ ہندوستان سے دو نمائندے ضرور بھیجے جائیں جو سیمی نار میں شریک ہوسکیں۔ ۱۷ جون کو شام کو وائس چانسلر نے مجھے ٹیلیفون کرکے دہلی بلایا اور کہا کہ آپ فورا افغانستان چلے جائیں اور مزید معلومات کے لیے دوسرے دن ساڑھے دس بجے اشوک مہتا ڈائریکٹر وانا (wana) سے ملنے کو کہا جو مغربی ایشیا اور شمالی افریقا کے مسایل کی نگرانی کرتے ہیں۔ میں ۱۸ کو ان سے ملا۔ انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں باوجود آخر وقت پر اطلاع کے، کسی طرح چلا ہی جاوں۔ میرے مشورے سے انھوں نے مالک رام صاحب کو بلایا اور ان کو بھی یہی تاکید کی۔

آج کل ملک سے باہر جانے کے سلسلے میں بڑے بڑے انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ پاسپورٹ بنوائیے، جس ملک میں جانا ہے، وہاں کی سفارت سے ویزا لیجیے۔ پھر پی فارم بھریئے۔ صحت کا سرٹیفکیٹ لیجیے، ایکسچینج حاصل کیجیے۔ بہ ہرحال وزارت خارجہ کی مہربانی سے سارے مراحل چند گھنٹوں میں طے ہوگئے۔ میں ۱۸ کی شام کی گاڑی سے علی گڑھ واپس آیا۔ نو بجے شب میں پہنچا۔ جلدی جلدی سامان باندھا اور ڈھائی بجے صبح کی دہلی ایکسپریس سے دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ صبح سوا چھے بجے دہلی پہنچا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور ناشتہ کرکے آٹھ بجے پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچا۔ وہاں تھوڑی دیر میں وزارت خارجہ کا ایک کارکن اور مالک رام دونوں آ گئے۔ کارکن نے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات حوالے کیے۔ ایکسچینج لیا۔ ساڑھے چھے پونڈ ملے۔ انیس کو ٹھیک نو بجے انڈین ایئر لائنز کارپوریشن کا وائی کاونٹ پالم سے اڑا۔ ہوائی جہاز میں کئی جگہیں خالی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کابل کے لیے زیادہ مسافر نہیں ہوتے۔ وائی کاونٹ تقریباً اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ ہم لوگ سوا تین گھنٹے میں کابل کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ کابل کا وقت، دہلی کے وقت سے ایک گھنٹا پیچھے تھا۔ گویا ہم دو گھنٹے میں کابل پہنچ گئے۔ ہوائی اڈے پر ہماری سفارت کے سیکرٹری مسٹر ورما اور ادارہ فرنکلین کے نمائندے خرم موجود تھے۔ انھوں نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور تھوڑی دیر میں ہم لوگ ہوٹل کابل[۳] پہنچا دیے گئے جہاں ہمارے قیام کے لیے کمرے پہلے سے محفوظ تھے۔

کابل میں موسم دہلی اور علی گڑھ کے مقابلے میں خوشگوار تھا۔ گرمی تھی مگر لو نہ تھی۔ دھوپ میں تمازت تھی مگر ہوا ٹھنڈی محسوس ہوتی تھی۔ سڑکیں نہایت چوڑی عمارتیں جدید طرز کی۔ ہوٹل کابل کے قریب پختونستان کا جھنڈا بھی لگا ہوا ہے۔ پاس ہی خیبر ریستوران اور سینما ہے، ہوٹل کابل سرکاری ہے اور وہاں مغربی معیار کے مطابق ہر آسایش موجود ہے۔ ہم لوگ سامان رکھ کر سفارت خانے گئے۔ سفیر صاحب کو اطلاع آئی۔ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ سفیر جنرل تھاپر ہندوستانی افواج کے کمانڈران چیف رہ چکے تھے۔ اپنے آپ کو سیدھا سادھا سپاہی کہتے ہیں لیکن نہایت کامیاب ڈپلومیٹ بھی ہیں۔ افغانستان کے لوگوں سے ان کے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ہم لوگوں سے تقریباً آدھے گھنٹے بڑی محبت اور بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے آنے پر بہت خوش تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے مسٹر ورما کے ساتھ کھایا۔ وہاں کئی اور ہندوستانی اصحاب موجود تھے۔ مسٹر ورما مہاراشٹر کے ہیں۔ فارسی بھی خوب بول لیتے ہیں۔ قندھار سے ہمارے سفارت خانے کے کچھ لوگ بھی آئے تھے۔ غرض دل چسپ صحبت رہی۔ (یکم جولائی ۱۹۶۶ء)

(۲)

کھانا کھا کر ہم ادارہ فرنکلین گئے۔ وہاں ادارے کے ڈائریکٹر عتیق اللہ پژواک[۴] سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمارا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ سیمی نار کے متعلق ضروری لیکچر دیا۔ کابل اور ہرات کے متعلق ادارے کی دو مطبوعات افغانستان اور کابل کا نقشہ، سیمی نار میں پڑھے جانے والے مقالات، سب ایک خوب صورت فائل میں تھے۔ انھوں نے چائے پلائی۔ بے دودھ چائے کا رواج یہاں عام تھا۔ میں روس میں اس قسم کی چائے پی چکا

ہوں۔ مالک رام صاحب بھی اس کے مزے کو ناپسند نہیں کرتے۔ غرض گھنٹے بھر کے قریب باتیں ہوئیں۔ اور پھر خرم کے ساتھ ہوٹل کابل واپس آ گئے۔ خرم کو میں نے شاہ زادہ خرم کہنا شروع کر دیا۔ یہ بڑے ہنس مکھ اور خلیق و متواضع آدمی ثابت ہوئے۔

واپس آ کر کچھ دیر آرام کیا۔ ہوٹل میں تیسری منزل پر مالک رام صاحب* کمرہ ۲۰۹ میں اور میں ۱۱۱ میں تھے۔ ہوٹل کے کارکن انگریزی سمجھ لیتے تھے، ویسے عام رواج فارسی کا ہے۔ ہم دونوں نے بھی فارسی کی ٹانگ توڑنا شروع کر دی۔ بیروں سے برابر فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ ۵ بجے کے قریب میں نے قاضی یونس کو ٹیلی فون کیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ مع بیوی اور دو چھوٹے بچوں کے اپنی کار لے کر آ گئے۔

قاضی یونس کا تعارف ضروری ہے۔ یہ علی گڑھ میں لیکچرر تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بڑے پرجوش کمیونسٹ تھے۔ پھر لیکچرر ہو گئے۔ لیکچرری کے زمانے میں ڈاکٹر ضیاء الدین سے اکثر جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ بڑے مخلص، پڑھے لکھے اور اصول پرست آدمی ہیں۔ بحث کرنے میں ان کو بہت لطف آتا ہے اور بڑی گرم جوشی سے بحث کرتے ہیں۔ اب تو وقت کے ہاتھوں خیالات اور مزاج دونوں میں خاصا اعتدال آ گیا ہے۔ ورنہ پہلے تو بغیر نوٹس دیے بھڑک جانے والا مادہ تھے۔ علی گڑھ سے پلاننگ کمیشن میں چلے گئے۔ سوئٹزرلینڈ اور انگلستان کئی سال رہے۔ اب اقوام متحدہ کے ٹیکنیکل امداد کے مشن کے ممبر ہیں اور چھے سات سال سے کابل میں ہیں۔ حکومت افغانستان ان کی صلاحیت پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ اور یہ بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ ان کی بیوی عائشہ، میرے پرانے ساتھی اختر حسن صاحب کی بیٹی ہیں۔ اختر حسن صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ یونس کی دو پیاری پیاری بچیاں ہیں۔ ایک پانچ سال کی، دوسری تقریبا تین سال کی۔ یونس نے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پھر اصرار کیا کہ چلیں قرغہ تک ہو آئیں۔ یہ کابل کی ایک سیرگاہ ہے، شہر سے قریبا دس میل کے فاصلے پر ایک مصنوعی جھیل ہے۔ چاروں طرف سرسبز پہاڑیاں ہیں۔ جھیل کے کنارے ایک خوب صورت ریستوران ہے۔ یہاں دیکھا تو یورپی سیاح اور افغانی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ تیر رہے تھے، کچھ چائے یا کافی پی رہے تھے۔ ہم لوگوں نے یونس کے اصرار پر کافی پی لی۔ یونس نے بتایا کہ گو یہاں کی پہاڑیاں عام طور پر بے آب و گیاہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن جہاں پانی پہنچ جاتا ہے وہاں خاصی ہریالی ہوتی ہے۔ ان سے افغانستان کی ترقی کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ افغانستان کو روس، امریکہ، جرمنی، انگلستان سبھی ممالک امداد دیتے ہیں۔ افغان بھی اتنے پختہ کار ہو گئے ہیں کہ سب سے دوستی رکھتے ہیں اور ان کا ملک ترقی کر رہا ہے۔ ہندوستان سے زیادہ تر چائے اور کپڑا آتا ہے۔ یہاں سے خشک اور تر میوہ جاتا ہے۔ مگر پاکستان سے راستہ ہونے کی وجہ سے تر میوہ بہت

---

* اردو، عربی اور فارسی کے نام ور عالم اور محقق مالک رام (۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء......۱۶ر اپریل ۱۹۹۳ء) کے کاموں میں ابوالکلام آزاد کے متون کی تدوین اور تذکرۂ معاصرین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ مصر میں بھارت کے کمرشل اتاشی رہے تھے۔ انھوں نے اس حیثیت سے بھی اپنے ملک کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کی کتاب تذکرۂ معاصرین پر انھیں ۱۹۸۳ء میں ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ دیا گیا۔ (ن ے میم عین)

کم جاپاتا ہے۔ ہوائی جہاز کی سروس ہفتے میں چار دفعہ ہے۔ ایک انڈین ائیر لائنز کی ہر اتوار کو، تین افغانستان کی ائیر لائن آریانا کی، ایک جمعرات کو دہلی کے لیے اور دو امرتسر کے لیے۔ شہر میں نئی عمارتیں تیزی سے بن رہی ہیں۔ سڑکیں روسیوں نے بنائی ہیں یا امریکیوں نے۔ کابل کا ہوائی اڈہ، روسیوں کا بنایا ہوا۔ اس کے جواب میں امریکیوں نے قندھار کا ہوائی اڈہ بنوایا ہے۔ مگر ابھی تک قندھار [ہوکر] کوئی بین الاقوامی ہوائی راستہ نہیں ہے۔

واپسی کے وقت شام ہوگئی تھی۔ قاضی یونس نے گاڑی سٹارٹ کرنی چاہی تو تیل زیادہ ہونے کی وجہ سے اس نے چلنے سے انکار کردیا۔ ہم لوگوں نے تھوڑی دیر دھکیلا مگر بی صاحبہ کا مزاج درست نہ ہوا۔ چنانچہ قرغہ ریستوران سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر رک گئے۔ قاضی واپس گئے اور کسی دوسری کار کے افغانی ڈرائیور کو لے آئے۔ اس سے کچھ نہ بنا۔ اندھیرے میں بہت دیر تک گاڑی کے پرزوں کی گوشمالی اور انجن کی دیکھ بھال کی۔ پھر ایک سکھ ادھر سے گزرے۔ ان سے ہم لوگ باتیں کرنے لگے۔ ان کے آدمی گاڑی کے انجن پر جھکے رہے اور قاضی دوڑ دوڑ کر گاڑی کے پیچھے سے اندھیرے میں اوزار نکال کر لاتے رہے۔ آٹھ بجے ہمارا ڈنر سیمی نار کے کارکنوں کی طرف سے باغ بالا میں تھا۔ جب آٹھ بج گئے تو سوچا کہ اب وہاں جانے سے کیا فائدہ، بھوک بھی نہ تھی۔ اس لیے طے کیا کہ ہوٹل پہنچ کر سو جائیں گے۔ یونس بار بار معذرت کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ ہم لوگ نو بجے ہوٹل کابل واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ سیمی نار والوں نے کار بھیجی ہے۔ کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔ اب جانا ہی پڑا۔ ساڑھے نو کے قریب باغ بالا پہنچے تو وہاں چڑھائی پر ایک خوب صورت عمارت میں بڑا شاندار ڈنر تھا۔ بلامبالغہ ڈیڑھ سو سے کم آدمی نہ تھے۔ ہم نے خضوع خشوع سے معذرت کی۔ معلوم ہوا ایسی دیر نہیں ہوئی تھی۔ اب تک لوگ پینے پلانے میں مصروف تھے۔ کھانا تو اسی وقت شروع ہوا تھا۔ افغانی مرد، عورتیں، سیمی نار میں ایران سے آنے والے نمائندے، امریکن، ایرانی مرد و، عورتیں، غرض بہت بڑا مجمع تھا۔ کھانا دیکھا تو میز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک درجنوں کھانے تھے۔ خوبانیاں، آڑو، گلاس (چیری) آلوچے بہ کثرت تھے۔ میں نے ذرا احتیاط برتی۔ ہاں پھلوں پر خاص توجہ دی۔ مالک رام صاحب تو ویسے ہی بہت محتاط آدمی ہیں۔ مختلف لوگوں سے فارسی میں یا انگریزی میں بات کرتے رہے۔ کچھ لوگ اردو جاننے والے بھی مل گئے۔ ایک افغانی لڑکی نے خاصی صاف اردو میں کہا کہ مجھے اردو بہت پسند ہے۔ میں نے پوچھا: کہاں سیکھی؟ بولی: پاکستان میں۔ غرض بڑی پُر لطف صحبت کے بعد ہم لوگ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل آئے۔ (۸ جولائی ۱۹۶۶ء)

(۳)

۲۰ جون کو صبح سے سیمی نار شروع ہونے والی تھی۔ ہم لوگ ذرا پہلے ہی تیار ہوگئے تھے۔ اور ہوٹل کابل کے آس پاس کا چکر لگا آئے۔ قریب ہی پختون سکوائر پر پختونستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر کچھ افغانی بلیڈ بیچ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر لطف آیا کہ بلیڈ کو یہ لوگ تیغ کہتے ہیں۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب خرم ایک بس لیے ہوئے پہنچے۔ ہمارے ہوٹل میں ہمارے علاوہ ایک تاجیکی نمائندے اور کچھ ایرانی آبزرور تھے۔ ایرانی نمائندے اور پاکستان

کے نمائندے قریب کے ہوٹل اسپینیر میں تھے۔ رات کو حامد علی خاں* اور عبدالشکور احسن** سے ملاقات ہو چکی تھی۔ عندلیب شادانی کی آمد بھی متوقع تھی، مگر وہ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ حامد علی خاں ہمایوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، ظفر علی خاں کے بھائی ہیں۔ بڑے کہنہ مشق ادیب اور زندہ دل آدمی ہیں۔ عبدالشکور احسن نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ یہ میاں محمد شریف*** کے بھانجے ہیں۔ شریف صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا۔ ان سے علی گڑھ کے پرانے دور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ خواجہ منظور حسین**** کی خیریت معلوم ہوئی۔ منظور صاحب میرے انگریزی کے استاد ہیں۔ جو تھوڑی سے بصیرت انگریزی ادب کے مطالعے سے ملی ہے، وہ ان ہی کی دین ہے۔

جب ہم بس میں بیٹھ کر پوہنتون کابل پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ پوہنتون پشتو میں یونی ورسٹی کو کہتے ہیں۔ سیمی نار پوہنتون کابل کی لائبریری کے ایک ہال میں تھا۔ افتتاحیہ اجلاس میں خاصا مجمع تھا اور اگرچہ دوسرے جلسوں

---

* ممتاز ادبی شخصیت، شاعر اور ہمایوں اور الحمرا جیسے ادبی جراید کے مدیر مولانا حامد علی خان (۱۹۰۱ء......۱۹۹۵ء) بانی زمیندار مولوی سراج الدین احمد خان (م: ۶/دسمبر ۱۹۰۹ء) کے صاحب زادے اور مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء......۱۹۵۶ء) کے سوتیلے بھائی تھے۔ انھوں نے مکتبہ فرینکلن کے زیر اہتمام بڑی تعداد میں معیاری کتب کے اردو تراجم شائع کیے۔ مختلف مطبوعہ نسخوں کی مدد سے دیوان غالب کا ایک تقابلی متن مرتب کیا جسے غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر پنجاب یونی ورسٹی نے شائع کیا۔ ان کی ادبی وراثت ماہنامہ الحمرا کو ان کے فرزند شاہد علی خان بڑی کامیابی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ (ز ے میم عین)

** پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن نے علی گڑھ سے ایم اے فارسی کیا۔ مدت العمر پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں فارسی کی تدریس کے فرائض انجام دیے اور یہاں صدر شعبہ فارسی اور ڈین آف فیکلٹی کے مناصب پر فائز رہے۔ مدت ملازمت پوری ہو جانے کے بعد ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ اردو، انگریزی اور فارسی میں متعدد وقیع تحریریں ان سے یادگار ہیں۔ (ز ے میم عین)

*** جدلیات اور مغربی فلسفے کے عالم میاں محمد شریف (۱۸۹۳ء......۱۹۶۵ء) علی گڑھ یونی ورسٹی اور کیمبرج یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل اور پاکستان کے مشہور فلسفی تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ فلسفہ اور انڈین فلوسوفیکل کانگریس کے صدر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ فلسفہ سے وابستہ ہوئے اور پاکستان فلوسوفیکل کانگریس کے صدر قرار پائے۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۶ء میں یونیسکو کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی اور انٹرنیشنل فیڈریشن آف فلوسوفیکل سوسائٹیز پیرس کے ڈائریکٹر قرار پائے۔ ان کی کتاب *History of Muslim Philosophy* اپنے موضوع پر اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے ۱۹۶۴ء میں انھیں تمغۂ امتیاز عطا کیا۔ (ز ے میم عین)

**** خواجہ منظور حسین انگریزی ادبیات کے نامور استاد تھے جو ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۵۴-۵۵ تا ۱۹۵۸-۵۹ء اس ادارے کے پرنسپل کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ *A History of Government College Lahore* کے مطابق A man of few words, Khwaja Manzoor Hosain had a constitutional temper and a deeep respect for orderly procedures تھے (ص۲۷۴) (ز ے میم عین)

میں حاضرین کی تعداد سے کم تھی مگر ڈیڑھ دوسو ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ وزیر معارف نے سیمی نار کا افتتاح کیا۔ ہمارے سفیر جنرل تھاپر بھی موجود تھے اور سفارت کے دوسرے حضرات بھی۔ دوسری سفارتوں کے لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے۔ وزیر معارف کی افتتاحیہ تقریر مختصر تھی لیکن مفید تھی۔ یہ نوجوان اور مستعد آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی تقریر کے بعد ادارہ فرینکلن کے ڈائریکٹر عتیق اللہ پژواک نے سیمی نار کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی۔ پھر غالباً پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اعلان کیا گیا کہ کابل کے پشتو اور دری کے پروفیسر عبدالحیی حبیبی * سیمی نار کی صدارت کریں گے۔ ایران کے پرویز ناتل خانلری اور تاجکستان کے پروفیسر معصومی نائب صدر مقرر ہوئے اور پاکستان کے عبدالشکور احسن رپورٹر[۵]۔ ہر جلسے کے لیے دو مقالے رکھے گئے تھے۔ چونکہ عندلیب شادانی ** نہ آسکے، اس لیے ان کا مقالہ نہ پڑھا گیا۔ یہ مقالہ مختصر تھا اور اس میں یہ نیک خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ تراجم کے ذریعے دنیا کی ساری اقوام کو ایک دوسرے کے قریب کیا جائے۔ پروفیسر عبدالحیی کا مقالہ لمبا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ضروری اجزا پڑھیں گے، مگر آخر کے کچھ پیراگراف چھوڑ کر پورا پڑھ دیا۔ اس مقالے میں عربی فارسی میں تراجم کی روایت کے سلسلے میں بنیادی اصولوں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد مقالے پر بحث ہوئی۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ پوہنتون کابل کے بعض نوجوان استادوں نے بڑے جوش و خروش سے بحث میں حصہ لیا۔ پشتو اکیڈمی کے صدر صدیق رشتین نے شکایت کی کہ پشتو کے ادب کے تراجم دوسری زبانوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں حال آں کہ پشتو میں فارسی، اردو اور عربی سے خاصی ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک اور دل چسپ شخصیت سرور گویا تھی۔ سید سلیمان ندوی *** نے اپنے سفرنامے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ اردو کی کئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں مگر گفتگو فارسی میں ہی کرتے ہیں۔ سرور گویا بھی ہر جلسے میں نہایت جوش اور اعتماد سے بحث کرتے

---

* ممتاز افغان محقق پروفیسر عبدالحیی حبیبی کے کاموں میں منہاج سراج کی طبقات ناصری کی تدوین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ (ز ے میم عین)

** ڈاکٹر عندلیب شادانی بہ قول پروفیسر نظیر صدیقی ''ایک خوش اخلاق خوش گفتار اور مجلس آرا انسان تھے''۔ مالک رام کی تذکرۂ معاصرین کے مطابق وہ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے ان کا اصل نام وجاہت حسین تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلم مورخین پر مقالہ لکھ کر لندن یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، مدت العمر ڈھاکہ یونی ورسٹی سے وابستہ رہے اور طویل عرصے تک فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ ۲۹/جولائی ۱۹۶۹ء کو راہی ملک عدم ہوگئے۔ ان کے ادبی سرمائے کا بڑا حصہ درسی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ انھوں نے تحقیق، شاعری اور کہانی نویسی میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ تحقیق کی روشنی میں ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۳ء) (ز ے میم عین)

*** محقق عالم اور مصنف سید سلیمان ندوی (۲۲/نومبر ۱۸۸۴ء......۲۲/نومبر ۱۹۵۳ء) مولانا شبلی نعمانی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ندوۃ العلما سے فارغ ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں اسی ادارے میں جدید عربی کے استاد مقرر ہوگئے۔ شبلی کی سیرت النبی کی تکمیل انھی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے علاوہ سیرت عائشہ، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، تاریخ ارض القرآن، نقوش سلیمانی، حیات شبلی، سیر افغانستان ان کی نمایاں کتب ہیں۔ انھوں نے فارسی شاعر خیام پر بھی ایک عالمانہ کتاب تحریر کی، وہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ (ز ے میم عین)

تھے۔ انھیں فارسی کے ہزاروں شعر یاد ہیں۔ میں چھیڑ چھیڑ کر ان سے پوچھا کرتا تھا کہ یہ شعر کس کا ہے، یہ مصرع کس کا ہے۔ ''اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری'' کے متعلق انھیں بھی کہنا پڑا کہ شاعر کا نام معلوم نہیں۔

پوہنتون کابل کے استادوں میں سے جن لوگوں نے سیمی نار کی بحثوں میں حصہ لیا ان میں حبیب اللہ لزمی ممتاز تھے۔ یہ بڑا جوشیلا نوجوان ہے۔ امریکہ میں لسانیات کی تعلیم حاصل کر چکا ہے، اب پشتو زبان پڑھا رہا ہے۔ نہایت پکا قوم پرست اور ترقی پسند خیالات کا حامل معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستان سے بڑی محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ (۲۲ جولائی ۱۹۶۶ء)

(۴)

بیس جون سے ہی ہمارا معمول یہ ہوگیا تھا کہ صبح نو بجے پوہنتون کابل پہنچ جاتے۔ دو گھنٹے مقالے سننے اور بحث کرنے کے بعد پندرہ بیس منٹ کے لیے چائے کا وقفہ ہوتا۔ اس کے بعد بحث شروع ہوجاتی جو ایک یا ڈیڑھ بجے ختم ہوتی۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل کابل میں یا خیبر ریستوران میں یا ہوٹل اسپین زر میں ہی ہوتا۔ کھانا دو بجے کے قریب شروع ہوتا اور ہم لوگ تین بجے کے قریب فارغ ہوجاتے۔ میں نے دیکھا کہ عام طور سے کھانے پر بئیر ضرور ہوتی تھی۔ ہمارے اور چند افغانی پروفیسروں کے سوا سبھی پینے والے تھے۔ ہمارے لیے سنترے اور اناس کا شربت ہوتا۔ ایک ایرانی نمائندے نے دیکھا کہ میرا شربت کا گلاس بار بار بھرا جا رہا ہے اور اس کا بئیر کا گلاس خالی ہے۔ اس نے مجھ سے ہنس کر پوچھا کہ آپ کے ساتھ رعایت کیوں ہو رہی ہے؟ میں نے کہا: اس لیے کہ شربت بہت ہے اور پینے والے کم ہیں۔ سہ پہر کو کوئی نہ کوئی پروگرام ضرور ہوتا تھا۔ پہلے دن ہم کابل میوزیم گئے۔ میوزیم بہت بڑا نہیں ہے مگر اس میں آثارِ قدیمہ بڑے سلیقے سے فراہم کیے گئے ہین اور افغانستان کی تقریباً چار ہزار سال کی تاریخ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ میں نے وہاں بدھ مذہب اور یونانی فتوحات کے گہرے اثرات دیکھے۔ پروفیسر حبیبی سے میں نے ہندوکش کی وجہ تسمیہ دریافت کی تو انھوں نے ہنس کر کہا کہ ہندو، سندھو یعنی دریا کے مترادف ہے اور کش کشان سے نکلا ہے۔ سندھو رفتہ رفتہ دریا کے بجائے علاقے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور اس طرح ہندوکش کشان کے علاقے کے لیے بولا جانے لگا۔

کابل میوزیم سے ہم بادشاہ خان * کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ قریب میں دارالامان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بادشاہ خان کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں انھیں علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ پٹھانوں کے لہجے میں اردو بول رہے تھے۔ تقریر تو معمولی تھی مگر ہر لفظ سے خلوص اور گداز ٹپکتا تھا۔ اس لیے اس کا سبھی پر اثر ہوا تھا۔ اس بات پر افسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان نے پٹھانوں

---

* خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان (۶؍فروری ۱۸۹۰ء......۲۰؍جنوری ۱۹۸۸ء) پشتونوں کے راہنما تھے۔ مہاتما گاندھی سے قربت اور ان کے شیوۂ عدم تشدد کے پرچارک ہونے کے باعث سرحدی گاندھی کہلائے۔ برطانوی دور میں انگریزوں کے خلاف اور آزادی کے بعد پختونوں کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے۔ سیاستدان خان عبدالولی خان اور ماہر تعلیم خان عبدالعلی خان ان کے صاحبزادے اور سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خانصاحب ان کے بڑے بھائی تھے۔ (ز ے میم عین)

سے جو وعدے کیے تھے، انھیں وہ بھولتا جا رہا ہے۔ بادشاہ خاں نے صاف کہا کہ ان کی تحریک ایک اصلاحی تحریک ہے۔ انگریزوں نے اس کے سیاسی امکانات کی وجہ سے اس کو کچلنا چاہا۔ انھوں نے اپنی نظر بندی کے زمانے میں اردو میں اپنی سوانح عمری لکھی تھی۔ مگر پاکستان کی حکومت نے اسے ضبط کرلیا۔ اب وہ دوبارہ اسے لکھنا چاہتے ہیں[٦]۔ ہم لوگ باتیں کرہی رہے تھے کہ تین نوجوان پختون ان کے پاس آئے۔ بادشاہ خان نے ہمیں ان سے ملوایا۔ جس عقیدت سے وہ بادشاہ خان کو دیکھ رہے تھے، اس سے اندازہ ہوا کہ بادشاہ خان کے کارکن اور خدائی خدمت گار ہوں گے۔ بادشاہ خان کو اس بات کا بہت رنج تھا کہ لوگ مذہب کے نام پر خون بہاتے ہیں اور فساد کرتے ہیں حالانکہ مذہب انسانوں کو قریب لانے والا ہے، جدا کرنے والا نہیں۔

دوسرے دن سہ پہر کو ہم سرکاری پریس دیکھنے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہاں آف سیٹ اور ٹائپ دونوں کی بڑی اچھی مشینیں تھیں۔ مینجر انگلستان کے تربیت یافتہ تھے۔ کابل کے سبھی اخبار اور بیش تر کتابیں یہیں چھپتی تھیں۔

سیمی نار کے دوسرے دن ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا مقصد سیمی نار کے آخری اجلاس میں آئندہ کے کام کے متعلق تجاویز پیش کرنا تھا۔ اس میں ایران کے ڈاکٹر پرویز خانلری، تاجکستان سے پروفیسر معصومی، ہندوستان سے مالک رام، پاکستان سے عبدالشکور احسن اور افغانستان سے حبیب اللہ لزمی اور علی محمد ہما لیے گئے تھے۔ ان لوگوں نے دو گھنٹے بیٹھ کر گفتگو کی اور متفقہ طور پر کچھ سفارشات کیں۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔ تیسرے دن دوپہر کا کھانا کابل کی ایک تفریح گاہ باغ تپہ میں ہوا۔ یہ باغ امیر امان اللہ نے بنوایا تھا۔ بڑا پرفضا مقام ہے۔ کھانے کے بعد ایک افغانی نے حافظؔ* کی کچھ غزلیں گائیں۔ بڑی پُر لطف صحبت رہی۔ یہاں کابل ریڈیو کے ایک صاحب نے ماوتھ پیس میرے منھ کے سامنے کرتے ہوئے مجھ سے سیمی نار کے متعلق کچھ سوالات کیے۔ عبدالشکور حسن اپنا کیمرہ ساتھ لائے تھے، انھوں نے ہم سب کی بہت سی تصویریں لیں۔ ہم لوگ باغ اور محل کی سیر کرنے نکلے۔ بزرگ مہر سے بہت دل چسپ باتیں رہیں۔ ہم لوگ پانچ بجے کے قریب واپس آئے۔

رات کو بھی کہیں نہ کہیں کھانے کی دعوت ہوتی تھی۔ دو راتیں خالی ملیں۔ چنانچہ ہم نے ایک شب کھانا یونس کے یہاں اور دوسری سب کھانا جوہری کے یہاں کھایا۔ جوہری کی بیوی کو اردو شاعری سے بڑی دل چسپی ہے۔ انھوں نے میری ایک غزل اور ایک نظم ریکارڈ کی۔ ایرانی سفارت نے کاک ٹیل پارٹی دی۔ وزیر اعظم نے

---

* فارسی غزل کے مسلم الثبوت شاعر خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (۱۳۱۵ھ......۱۳۹۰ھ) کا دیوان عرفا اور عشاق کے لیے حرز جان کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ والد بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے انھوں نے زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے ایک خمیر ساز کے ہاں ملازمت اختیار کی، شاعری کا شوق شیخ محمود عطار کے پاس لے گیا۔ اپنے کمال فن سے یہاں تک ترقی کی کہ وقت کے حکمران بھی ان کے نیازمند ہو گئے۔ ۱۳۸۷ھ میں جب تیمور شیراز گیا تو اس نے بھی ان سے ملاقات کی۔ شیراز ہی میں مدفون ہیں ان کی قبر جس باغ میں ہے وہ حافظیہ کہلاتا ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ (ز ے میم عین)

چہل ستون میں استقبالیہ دیا۔ بہت دیر تک ہندوستان کے ساتھ دوستی اور محبت کا اظہار کرتے رہے۔ ہمارے سفیر نے اس دن بتایا کہ ذاکر صاحب* کے آنے کا پروگرام بن گیا ہے اور وہ دس جولائی سے پندرہ جولائی تک افغانستان کا دورہ کریں گے۔ (یکم اگست ۱۹۶۶ء)

(۵)

سیمی نار کی چھ نشستیں ہوئیں۔ پہلے چار دن روز ایک نشست ہوتی تھی، آخری سنیچر کو صبح اور شام دونوں وقت ہم لوگ جمع ہوئے۔ جمعہ کا دن افغانستان میں عام تعطیل کا ہوتا ہے، بلکہ جمعرات کی سہ پہر سے سرکاری دکانیں بند ہوجاتی ہیں۔ جمعہ کو ہم لوگوں کو سیر کے لیے سالنگ کی طرف لے جایا گیا۔ سالنگ ہندوکش میں ایک درہ ہے جو کابل سے ۸۰ میل کے قریب ہے۔ ہم لوگ جبل السراج سے کچھ آگے تک گئے۔ راستے میں دونوں طرف انگور کی بیلیں تھیں۔ حبیب اللہ لزمی نے بتایا کہ یہاں دس بارہ قسم کے انگور ہوتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مکانات تھے جن کی دیواروں میں شگاف تھے۔ یہ اس لیے تھے کہ انگور سکھائے جاسکیں۔ انگور کے علاوہ آڑو، آلوچوں اور خوبانیوں کے بہ کثرت پیڑ تھے۔ کوہِ دامن اس علاقے کا نام ہے۔ بچہ سقہ یہیں کا رہنے والا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اب تک اس کا خاندان موجود ہے اور اس کی بیوی کے پاس متعدد مکانات ہیں۔ بچہ سقّہ نے چند دن کی بادشاہت میں روشن خیال افغانیوں کے ساتھ بڑے مظالم کیے تھے مگر ان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس کے بعد بچوں کے ساتھ بھی کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ کابل کے اردگرد کے پہاڑ بیش تر خشک چٹانوں کا سلسلہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کوہِ دامن میں سبزہ بھی ہے، باغات بھی ہیں اور پانی بھی۔ سڑک ہماری مسوری، نینی تال کی سڑکوں کی طرح چوڑی تو نہیں مگر نہایت اچھی ہے۔ روسیوں نے بنائی ہے۔ چارہ کار پہنچتے ہی ہم لوگوں کو اتنی بھوک لگی کہ دکان پر سے کھیرے خرید کر کھائے اور بڑے مزے کے معلوم ہوئے۔ یہیں سے ایک پہاڑی دریا ملا جس کی تیزی اور روانی پہل گام کے دور کی یاد دلاتی تھی۔ ہم لوگ جبلِ السراج سے آگے اس مقام تک گئے جہاں ایک دوسرا دریا اس دریا میں مل جاتا ہے۔ اس دریا پر ایک پل ہے جس کے نیچے بہت سے افغانی پک نک منا رہے تھے۔ یہاں ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ ایک افغانی نے پستے اور بادام سے ہماری تواضع کی۔ پھر ہم واپس ہوئے اور کچھ دور سے واپس آنے کے بعد استالیف کے راستے پر مڑ گئے۔ سالنگ کی سڑک تارکول کی ہے۔ یہ سڑک ویسی نہ

---

* ڈاکٹر ذاکر حسین (۸؍فروری ۱۸۹۷ء......۳؍مئی ۱۹۶۹ء) بھارت کے تیسرے منتخب صدر تھے۔ ان کے والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے ابتدائی تعلیم علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں معاشیات کے مضمون میں برلن یونی ورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تیئس برس کی عمر میں اپنے ہم خیالوں سے مل کر پہلے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی جو ترقی کرتا ہوا ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کہلایا۔ وہ اکیس برس تک اس ادارے کے سربراہ رہے۔ ۱۹۵۷ء میں صوبہ بہار کے گورنر ۱۹۶۲ء میں بھارت کے نائب صدر اور ۱۳؍مئی ۱۹۶۷ء کو صدر مملکت بنے وہ اس منصب پر اپنی وفات تک کام کرتے رہے۔ وہ بھارت کے پہلے صدر تھے جنھوں نے اپنے عرصہ صدارت کے دوران انتقال کیا۔ حکومت ہند کی طرف سے انھیں بھارت رتن اور پدم بھوشن کے اعزاز دیے گئے۔ (ز ے میم عین)

تھی۔ استالیف جس کے معنی یونانی میں غالباً شراب کے پیالے کے ہیں، اونچائی پر بسا ہوا ہے اور بڑا پُر فضا مقام ہے۔ یہاں سرکاری رہائش گاہ بھی ہے، جس میں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ یہیں قمر رئیس سے ملاقات ہوئی جو تاشقند سے واپسی پر کابل میں اپنے بہنوئی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور سیر کے لیے استالیف آئے تھے۔ اس دن سات بجے ہمیں اپنے سفیر سے ملنا تھا۔ چنانچہ چار بجے کے قریب وہاں سے چلے اور ساڑھے چھے بجے تک ہوٹل کابل میں پہنچ گئے۔ یہ سیر بہت اچھی رہی۔ راستہ بھی خوب صورت تھا اور ساتھیوں سے ادھر ادھر کی مزیدار باتیں بھی ہوئیں۔ ایرانیوں میں خان لزمی ذرا متین اور خاموش آدمی ہیں۔ بزرگ مہر دل چسپ ہیں اور خاصے باغ و بہار۔ احمد کردامؔ اور نجف دریا بندری سے زیادہ باتیں رہیں۔ افغانیوں میں حبیبی، گویا اعتمادی اور حبیب اللہ لزمی سے مختلف مسایل پر تبادلہ خیال ہوا۔ حبیبی کبھی فارسی میں باتیں کرتے، کبھی انگریزی میں، کبھی اردو میں۔ بڑا مزا آتا تھا۔ حامد علی خاں اور عبدالشکور سے بھی پاکستان میں اردو ادب کی ترقی کی رفتار پر تبادلہ خیال ہوا۔

نان آزاد یعنی رات کے کھانے کے لیے آزادی سے ہم نے فائدہ اٹھا کر جوہری کے ہاں کھانا کھایا۔ سفیر سے رخصت ہوکر ہم سیدھے جوہری کے یہاں پہنچ گئے۔

کابل کے بازاروں میں بھی گھومنے پھرنے کا کچھ اتفاق ہوا۔ دکانوں میں اونی اور سوتی کپڑے، بجلی کا سامان اور عورتوں کی آرائش کی چیزوں کی بڑی بہتات نظر آئی۔ سیاحوں کے لیے جو بڑی دکانیں ہیں، ان میں قیمتیں خاصی گراں ہیں مگر بازار میں پھریں اور چھوٹی دکانوں پر جائیں تو خاصی سستی چیزیں مل جاتی ہیں۔ جا بہ جا ہندوستانی دکاندار نظر آئے یعنی کابل کے بازاروں میں اردو سمجھنے والے خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی عام حالت اور علی گڑھ کے متعلق بھی مجھ سے سوالات کیے۔ علی گڑھ سے افغانیوں کو خاصا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ افغانی بہت مہمان نواز ہیں۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے۔ پژواک نے مجھ سے کہا کہ ہمارا ملک بہت مال دار نہیں مگر محبت کی دولت سے ہم مالا مال ہیں۔ ہندستان کے لیے دوستی کے جذبات خاص و عام سب میں، میں نے پائے۔ (۸/ اگست ۱۹۶۶ء)

(۶)

سیمی نار کی بحث سے اندازہ ہوا کہ ترجمے کے لیے مغربی زبانوں سے اصطلاحات بہ جنسہٖ لینے کی روش کو اب زیادہ پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا اور نہ صرف قدیم اور کلاسیکی زبانوں کی مدد سے وضع اصطلاحات کو، بلکہ اس معاملے میں ایک میانہ روی کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک بھی ہے یعنی ان اصطلاحات کو مغربی زبانوں سے لینے میں کوئی حرج نہیں جن کے مفہوم کو ہماری قدیم یا موجودہ زبانیں پوری طرح ادا نہیں کرسکتیں، مگر یہ عمل اس بے پروائی [کذا] سے نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے موجودہ سرمایے سے بالکل فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ایران میں عربی کی اصطلاحات کے بجائے فارسی کی اصطلاحات استعمال کرنے کا طریقہ اب عام ہوگیا ہے، مثلا: consciousness کے لیے شعور کے بجائے آگاہی۔ تاجک زبان اور اردو میں اب بھی بہت سی اصطلاحیں عربی کی ہیں۔ ایک تاجک نمائندے نے اعتراض بھی کیا کہ اگر ایران عربی اصطلاحوں کو چھوڑ دے گا اور مغربی زبانوں خصوصا فرنچ یا انگریزی سے لے گا یا فارسی کی

اصطلاحیں اس کی جگہ وضع کرے گا، تو تاجکستان سے قرب ہونے کے بجائے بُعد ہوگا۔ اس لیے یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ جو اصطلاحیں عام ہوگئی ہیں اور ایران، افغانستان ، ہندوستان اور پاکستان میں استعمال ہو رہی ہیں، انھیں حتی المقدور نہ بدلا جائے۔

سیمی نار میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نہ صرف ان ہمسایہ ملکوں کے ادب کو مالا مال کرنے اور ان زبانوں کے علمی معیار کو بڑھانے کے لیے ترجمہ ضروری ہے، بلکہ ترجمے سے ان ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب اور سب کو جدید علمی معیار سے قریب لایا جاسکتا ہے۔ یعنی ترجمہ ہمسایہ ملکوں کو بھی قریب لاسکتا ہے اور اتحاد بین الملت میں بھی مدد دے سکتا ہے۔

یونی ورسٹیوں کی تعلیم کے سلسلے میں یہ سوال بھی اٹھا کہ کیا جدید مغربی علوم کو مغربی زبانوں کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کے ذریعے سے پڑھانا بہتر ہوگا جس کے لیے ان زبانوں سے اچھی واقفیت ضروری ہے یا جدید مغربی علوم کو ترجمے کے ذریعے سے منتقل کرکے علمی مزاج پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ جدید مغربی زبانوں کے اچھی طرح جاننے والے بہ ہر حال بہت زیادہ نہ ہوں گے۔ ملک میں علمی معیار کو بلند کرنے کے لیے جدید علوم کو ترجمے کے ذریعہ سے پیش کرنا، بالآخر مجموعی طور پر ملک میں جدید نظر پیدا کرنے کے لیے زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ شاعری اور ناول کے ترجمے کے سلسلے میں کلاسیکل زبانوں سے زیادہ سلیقے سے کام لیا جاسکتا ہے۔ شاعری اور ناول کے ترجمے میں آزاد ترجمہ بھی مفید ہوسکتا ہے لیکن بچوں کے ادب کے سلسلے میں مغربی قصوں کو اپنانا اور انھیں اپنے ماحول میں پیش کرنا یقیناً اور زیادہ مفید ہوگا۔ ترجمے کے سلسلے میں اس بات سے بھی اتفاق کیا گیا کہ جس کی مادری زبان فارسی یا اردو ہے، وہی انگریزی یا فرانسیسی ادب کا ترجمہ اپنی زبان میں بہتر کرسکتا ہے، ہاں اسے انگریزی یا فرانسیسی سے اچھی واقفیت ہونی چاہیے۔ اس کے ترجمے پر پھر کسی ایسے انگریز یا فرانسیسی کی نظر ثانی ہونی چاہیے جو اردو یا فارسی اچھی طرح جانتا ہو۔

آخری اجلاس میں ذیلی کمیٹی کی حسب ذیل سفارشات متفقہ طور پر منظور ہوئیں:

۱۔ کابل میں ایک مرکزی دفتر قائم کیا جائے جو سیمی نار کے کاموں کو آگے بڑھائے۔
۲۔ یہ مرکزی دفتر ان تمام ممالک سے ربط کرے جن کے نمائندے سیمی نار میں شریک ہوئے۔
۳۔ اس دفتر میں ان تمام ممالک میں ترجمے کے کام کے سلسلے میں مکمل معلومات جمع کی جائیں۔
۴۔ شریک ملکوں میں ترجمے کی ہر کتاب کے پانچ نسخے مرکزی دفتر کے لیے بھیجے جائیں۔
۵۔ شریک ملک ایک دوسرے کے ترجمے کے کام سے مرکز کے ذریعے سے واقف رکھے جائیں۔
۶۔ ہر ملک اس مرکزی دفتر کے لیے نمائندہ منتخب کرے۔
۷۔ کوشش کی جائے کہ اصطلاحات جس حد تک ہوسکے، یکساں ہوں۔
۸۔ حسبِ ضرورت اس قسم کے اور سیمی نار کیے جائیں۔

کانفرنس کے ختم پر ایران کی طرف سے سیمی نار میں شریک ہونے والوں کو کتابوں کا ایک سیٹ نذر کیا گیا۔ اس میں سائنس، سماجی علوم اور ادبی کتابوں کے ترجمے شامل ہیں، نیز رسالہ ''سخن'' کے کچھ شمارے بھی۔

ہم لوگ ان کتابوں کو ساتھ لانے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان کا وزن کافی تھا۔ ہمارے سفارت خانے کی سفارش پر ہوائی جہاز والوں نے اجازت دے دی[۵]۔ اتوار کو دوپہر کو کابل پہنچے تھے۔ دوسرے اتوار کو دو بجے کابل کے حساب سے وہاں سے روانہ ہوئے اور دہلی کے حساب سے چھ بجے پالم کے ہوائی اڈے پر اتر پڑے۔ ہوائی اڈے پر بارش نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ مالک رام صاحب کی وجہ سے کسٹم والوں سے جلد نجات مل گئی۔

میں ان کے گھر ہوتا ہوا اسٹیشن پہنچا اور رات کے گیارہ بجے علی گڑھ آیا۔ صدیوں پہلے جو سفر مہینوں میں طے ہوتا تھا، اسے ہم نے چند گھنٹوں میں طے کرلیا۔ ہاں افغانستان کی ترقی، وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی اور محبت اور وہاں کے مناظر کی خوب صورتی کا نقش دل پر باقی ہے۔ (۱۵اگست ۱۹۶۶ء)

حواشی:

[۱] آپ بیتی میں لکھا ہے: ''کابل کے بین الاقوامی ترجمہ سیمی نار'' (ص ۲۲۳) یہ بھی لکھا ہے: ''سیمی نار کا موضوع فارسی میں تراجم کی صورتِ حال تھا''۔ (ص ۲۲۴)

[۲] آپ بیتی میں: ''ایران، تاجکستان، پاکستان، افغانستان سے مندوبین آئے تھے، ہندوستان سے صرف مشاہد (observer) تھے۔''

[۳] آپ بیتی: ''ہم لوگ پشتون ہوٹل پہنچائے گئے۔'' (ص ۲۲۴)

[۴] آپ بیتی: ''عتیق اللہ بژواک''۔ (ص ۲۲۴)

[۵] اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ فارسی میں ایک مقالہ پروفیسر عبدالشکور احسن، حیات اور علمی و ادبی خدمات کے عنوان سے لکھا گیا تھا۔ ایم اے فارسی کی تکمیل کے لیے یہ مقالہ روزینہ یاسمین نے ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۱ء کی تعلیمی میقات میں استاد شعبہ فارسی محمد سلیم مظہر کی زیرِنگرانی لکھا۔ احسن صاحب کے سفرِ کابل کے بارے میں کچھ معلومات مذکورہ مقالے میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً: ایک روایت ہے کہ وزیرِ تعلیم نے سیمی نار کا افتتاح کیا۔ عبدالحیی حبیبی کو متفقہ طور پر سیمی نار کا صدر چنا گیا۔ سیکرٹری کے لیے سوویت روس کے وفد کے رکن رحیم ہاشموف نے عبدالشکور احسن صاحب کا نام پیش کیا۔ پرویز ناتل خانلری نے تائید کی۔ اس طرح احسن صاحب متفقہ طور پر سیمی نار کے سیکرٹری مقرر ہوگئے۔ اس زمانے میں کابل میں ٹی وی نہیں تھا البتہ ریڈیو اور اخبارات نے ان کا انٹرویو نشر کیا۔ سیمی نار کے مقالات کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔ سیمی نار کی پوری روداد بھی اس میں شامل تھی۔ (ص ۱۸۔۱۹)

[۶] آپ بیتی: ''وہاں معلوم ہوا، خان عبدالغفار خاں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں اُن سے ملنے گئے۔ وہ پختونستان کے لیے پروپیگنڈا کرنے آئے ہوئے تھے۔ ان سے شیخ عبداللہ کا ذکر آیا۔ کہنے لگے: شیخ کبھی پاکستان سے الحاق نہ کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ پنجابی کشمیریوں کو کس قدر حقیر سمجھتے ہیں۔ انھیں ہاتو کہتے ہیں۔ کانگریس سے بھی وہ خاصے ناراض تھے۔ کہنے لگے: ان لوگوں نے ہمیں دھوکا دیا۔ ہاں، گاندھی کی برابر تعریف کرتے رہے۔ (ص ۲۲۵)

۷؎ آپ بیتی میں تین بار ''احمد آرام'' لکھا ہے۔ اور، مزید: ''احمد آرام نے کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان سے اصطلاحات سازی پر بات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ان عربی اصطلاحوں کو جو عرصے سے فارسی میں رائج ہیں، کیوں ترک کر دیا، مثلاً: شعور کی جگہ آگہی، تحت شعور کی جگہ تحت آگہی۔ انھوں نے کہا: پہلے تو اس معاملے میں خاص شدت تھی اور ایرانی قوم پرستی کی وجہ سے تھی اب ہم سب اصطلاحوں کو نہیں بدل رہے ہیں۔'' (ص۲۲۴)

۸؎ آپ بیتی ''کابل میں پستے بہت اچھے ملے، تھوڑے سے ساتھ لیتا آیا۔'' (ص۲۲۶)

◆